مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

عقل، فطرت اور ایمان

سورہ آل عمران کے آخری رکوع کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب — درس ٦

عقل' فطرت اور ایمان

سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی روشنی میں

مقرر و مدرس

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

٣٦ - کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور فون : ٣-٥٨٦٩٥٠١

نام کتاب ــــــــــــــــ عقل، فطرت اور ایمان (درس نمبر ٦)

باراول (اپریل ١٩٩٧ء) ــــــــــــــــ ٢٢٠٠

باردوم (مارچ ٢٠٠٢ء) ــــــــــــــــ ٢٢٠٠

ناشر ــــــــــــــــ ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت ــــــــــــــــ ٣٦۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور ٥٤٧٠٠

فون: ٣-٥٨٦٩٥٠١

مطبع ــــــــــــــــ شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت ــــــــــــــــ ١٠ روپے

درس ٦

عقل' فطرت اور ایمان

سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی روشنی میں

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ ٥ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ٥

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الأَلْبَابِ ٥ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً، سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ٥ رَبَّنَآ إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ، وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ٥ رَبَّنَآ إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْإِيْمَانِ أَنْ ءَامِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا، رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الأَبْرَارِ ٥ رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلاَ تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ، إِنَّكَ لاَ تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ٥ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّيْ لاَ أُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى، بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ، فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الأَنْهَارُ، ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ٥ (آل عمران: ١٩٠: ١٩٥)

ان صفحات میں قرآن مجید کے جس منتخب نصاب کی مختصر اور عام فہم توضیح و تشریح کا سلسلہ چل رہا ہے اس کے ضمن میں بفضلہ تعالیٰ پانچ اسباق یعنی سورۃ العصر، آیۂ بر، سورۂ لقمان کا دوسرا رکوع، سورۂ حٰم السجدۃ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ اور سورۃ الفاتحہ کی اجمال کے ساتھ تشریح ہو چکی ہے۔ اس سلسلے کا چھٹا سبق سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی ابتدائی چھ آیات (آیات نمبر ۱۹۰ تا ۱۹۵) پر مشتمل ہے ــــ آیئے پہلے ہم ان آیاتِ مبارکہ کے ایک سلیس و رواں ترجمے پر نظر ڈال لیں تا کہ ان میں جو مضامین و مباحث آرہے ہیں ان کا ایک اجمالی نقشہ سامنے آجائے۔ ان آیات کا ترجمہ ہے :

"یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں ہوشمند اور باشعور لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ وہ لوگ جو یاد رکھتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور غور و فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں۔ (وہ پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بیکار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے، تُو اس سے پاک ہے، پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ اے رب ہمارے! جسے تو نے آگ میں داخل کر دیا اسے تو تُو نے رسوا کر دیا، اور ایسے ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں ہو گا۔ اے رب ہمارے! ہم نے ایک پکارنے والے کی پکار کو سنا کہ وہ ایمان کی دعوت دے رہا ہے کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر۔ پس ہم ایمان لے آئے۔ سواے ہمارے رب! ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور فرما دے اور ہمیں نیکوکار بندوں کے ساتھ وفات دیجئو۔ اور اے رب ہمارے! ہمیں عطا فرما جس کا تو نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے اپنے رسولوں کی وساطت سے، اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجئو۔ یقیناً تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔ پس ان کی دعا قبول فرمائی ان کے رب نے کہ میں تو کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں، خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت۔ تم سب ایک دوسرے ہی سے ہو۔ تو وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور جنہیں میری راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں اور جنہوں نے جنگ کی اور جنہوں نے اپنی گردنیں کٹوا دیں، میں ان کی برائیوں کو لازماً ان سے دور کر دوں گا اور ان کو لازماً داخل کروں گا ان

باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ یہ بدلہ ہو گا اللہ کے خاص خزانہ ء فضل سے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اچھا بدلہ تو اللہ ہی کے پاس ہے۔"

چند تمہیدی باتیں

اس سے پہلے کہ ہم ان آیات مبارکہ میں وارد مضامین پر سلسلہ وار غور کریں مناسب ہو گا کہ اب تک کے معمول کے مطابق چند تمہیدی باتیں سمجھ لیں۔

زیر نظر آیات کی عظمت و فضیلت

سب سے پہلی بات جو قرآن مجید سے ذہنی مناسبت پیدا کرنے میں ممِدّ ہے وہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کی طویل سورتوں میں سے اکثر و بیشتر کے آغاز اور اختتام پر جو آیات وارد ہوتی ہیں وہ بالعموم نہایت جامع ہوتی ہیں۔ یہ بات عام دنیوی ادب کے اصول کے مطابق بھی ہے' جیسے کسی قصیدے یا غزل کے مطلع اور مقطع کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے اور کسی قادر الکلام خطیب کے خطبہ کے افتتاحی اور اختتامی کلمات بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کی اکثر طویل سورتوں کے آغاز اور اختتام پر وارد ہونے والی آیات بھی بہت جامع ہوتی ہیں۔ انہیں اصطلاحاً فواتح و خواتیمِ سُوَر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ کی ابتدائی اور آخری آیات کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ یہی وصف بتمام و کمال سورۂ آل عمران کی زیر نظر آیات مبارکہ میں موجود ہے۔

ان آیات کی عظمت و فضیلت کے سلسلے میں جو روایات وارد ہوئی ہیں' ان میں سے دو کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ پہلی روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے' جسے ان آیات کا شان نزول بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان سے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) نے یہ فرمائش کی کہ امّ المومنینؓ! مجھے آپ وہ واقعہ سنایئے جو نبی اکرم ﷺ کے احوال و واقعات میں آپ کو سب سے پیارا لگا ہو۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک گہرے احساس کے ساتھ یہ فرمایا کہ "آنحضورؐ کی تو ساری ہی باتیں نہایت پیاری تھیں اور آپؐ کی تو ہر ادا دلآویز تھی' تاہم تم نے فرمائش کی ہے تو میں تمہیں ایک واقعہ سناتی ہوں۔

ایک شب کو حضورؐ میرے پاس تشریف لائے لیکن اچانک آپؐ نے مجھ سے فرمایا : اے عائشہ! مجھے اجازت دو' میں اِس وقت اپنے اللہ کی عبادت کرنا چاہتا ہوں ـــــ میں نے عرض کیا : حضورؐ! مجھے آپؐ کا قرب نہایت عزیز ہے لیکن جو چیز آپؐ کو پسند ہو وہ اس سے بھی زیادہ محبوب ہے' للٰہذا آپ کو اجازت ہے۔ تو آپؐ نماز پڑھنے کھڑے ہوئے اور آپؐ پر رِقّت طاری ہوئی اور آپؐ روتے رہے' یہاں تک کہ آپؐ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ پھر آپؐ نے بہت طویل سجدہ کیا' اس میں بھی گریہ طاری رہا جس کی بناء پر سجدہ گاہ تر ہو گئی۔ پھر آپؐ کچھ دیر لیٹے رہے لیکن وہ کیفیت آپؐ پر برقرار رہی' یہاں تک کہ صبح صادق ہو گئی اور آپؐ پر رِقّت اور گریہ کی وہی کیفیت طاری رہی۔ حضرت بلالؓ جب فجر کی نماز کی اطلاع دینے کے لئے حاضر ہوئے اور انہوں نے بھی آنحضور ﷺ کی اس کیفیت کو دیکھا' اس پر انہوں نے عرض کیا : حضورؐ! آپؐ پر یہ رقت اور یہ گریہ کیسا؟ حالانکہ اگر بالفرض آپؐ سے کوئی خطا اور لغزش ہوئی بھی ہو تو اللہ تعالیٰ آپؐ کی تمام خطاؤں کو بخش دینے کا اعلان فرما چکا ہے۔ تو جواب میں آپؐ نے فرمایا : "اے بلال' میں کیوں نہ روؤں کہ آج کی شب میں میرے رب نے مجھ پر یہ آیات نازل فرمائی ہیں"۔ پھر آپؐ نے ان آیات کی تلاوت فرمائی : اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ O ...... الیٰ آخر السورۃ۔"

دوسری روایت کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ : "نبی اکرم ﷺ کے معمول میں یہ شامل تھا کہ جب آپؐ رات کے وقت تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو آنکھ کھلتے ہی بے اختیار آپؐ کی زبان مبارک پر یہ آیات جاری ہو جاتی تھیں"۔ اب آپ چشم تصور سے دیکھئے کہ اللہ کا محبوب بندہ پچھلی رات کو اٹھا۔ اوپر آسمان ہے' ستارے ہیں اور ماحول پر تاریکی اور سکون کی کیفیت طاری ہے۔ اس وقت جو واردات قلب پر طاری ہو رہی ہے اس کی بہترین ترجمانی مندرجہ بالا آیات مبارکہ سے ہو رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ آنحضورؐ کو ان آیات مبارکہ سے خصوصی شغف تھا۔ ان دونوں روایات کو امام رازیؒ اپنی تفسیر کبیر میں لائے ہیں۔

آیاتِ مبارکہ کا موضوع : "ترکیبِ ایمان"

دوسری قابلِ غور بات ان آیات کا موضوع ہے۔ ان آیات کے لئے موزوں عنوان "ترکیبِ ایمان" ہے۔ یعنی یہ کہ ایمان کیسے وجود میں آتا ہے اور ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی ایمان باللہ ' ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالرسالت میں باہمی ربط اور ترتیب کیا ہے اور خاص طور پر یہ کہ ایمان کے ضمن میں قرآن کا اپنا مخصوص طرزِ استدلال کیا ہے! وہ کس انداز اور اسلوب سے ایمان باللہ کی دعوت دیتا ہے اور کن دلائل سے معاد یعنی آخرت کا اثبات کرتا ہے۔ پھر یہ کہ اس ایمان کے نتیجے میں انسانی شخصیت میں کیا کیفیات پیدا ہونی چاہئیں۔ یہ نہایت اہم موضوع ہے۔ اس لئے کہ کون نہیں جانتا کہ ہمارے دین کی جڑ اور بنیاد ایمان ہی ہے۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے قبل مناسب ہے کہ ایمان کے بارے میں چند بنیادی امور ذہن نشین کر لئے جائیں۔

ایمان کے بارے میں چند بنیادی امور

ایمان چند ماورائی حقائق اور چند امورِ غیبی کو مان لینے کا نام ہے لیکن اس ایمان کے دو درجے ہیں' ایک درجہ قانونی اور فقہی ایمان کا ہے جس کی بنیاد پر ہم اس دنیا میں ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ اس کا سارا دارومدار "اقرارٌ بِاللّسان" پر ہے۔ یعنی زبان سے اقرار کرنا کہ میں مانتا ہوں اللہ کو' اس کی صفاتِ کمال کو' اس کی توحید کو ـــــ میں مانتا ہوں آخرت کو' قیامت کو' بعث بعد الموت کو' حشر و نشر کو' حساب کتاب کو' جزا و سزا کو' جنت و دوزخ کو ـــــ اور میں مانتا ہوں نبوت و رسالت کو' ملائکہ کو' وحی کو' کتابوں کو' نبیوں اور رسولوں کو اور حضرت محمد ﷺ کے خاتم النبیین والمرسلین ہونے کو۔ ان امور کا زبانی اقرار دنیا میں ہمارے مسلمان ہونے کی بنیاد ہے۔ ایمان کا دوسرا رخ یا دوسرا پہلو یا دوسرا درجہ ہے حقیقی ایمان کا ـــــ اور وہ عبارت ہے قلبی یقین سے۔ یعنی ان تمام امور پر دل میں پختہ یقین پیدا ہو جائے۔ اس کا اصطلاحی نام ہے "تصدیقٌ بِالقلب"۔ اور واقعہ یہ ہے کہ آخرت میں کامیابی و کامرانی اور فلاح و نجات کا دارومدار اس حقیقی و قلبی ایمان پر ہے۔

جہاں تک پہلے ایمان یعنی اقرارٌ باللسان کا تعلق ہے' اس کے بارے میں گفتگو کی ہمیں خاص حاجت نہیں ہے۔ وہ تو ہمیں موروثی طور پر مل ہی گیا ہے۔ ہم مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے تو وراثت میں یہ عقائد ہمیں منتقل ہو گئے۔ لیکن اصل چیز وہ یقین قلبی ہے جس پر آخرت میں نجات کا انحصار ہے۔ ہمیں اس کی فکر کرنی چاہئے۔ چنانچہ وہ یقین قلبی اور ایمانِ حقیقی ان آیات کا موضوع ہے۔

اس ضمن میں یہ نکتہ نوٹ کرلینا چاہئے کہ اگر ایک انسان جس نے مسلمان معاشرے میں آنکھ کھولی اور وہ دین کے اوامر و نواہی پر کاربند ہے تو چاہے ذہن' فکر اور شعور کی سطح پر اسے ان ماورائی حقائق اور امورِ غیبی کا حقیقی ادراک حاصل نہ ہو تب بھی اسلامی شعائر و احکام پر مسلسل عمل کرنے سے اس کو ایک نوع کے قلبی یقین کی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ جس طرح انسان کا باطن اس کے ظاہر پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح اس کا ظاہری طرز عمل اور اس کا ظاہری رویہ بھی اس کے باطن پر عکس ڈالتا ہے۔ چاہے آپ اسے ایک غیر شعوری یقین کہہ لیں لیکن وہ ہوتی یقین ہی کی کیفیت ہے۔ تاہم ہمیں اِس وقت اس سے بحث نہیں ہے۔ ان آیات میں جو گفتگو ہو رہی ہے وہ اکتسابی اور شعوری ایمان کی ہے جس کو ایک ذہین و فطین اور صاحب شعور و ادراک انسان اپنے ذاتی غور و فکر کے نتیجے میں حاصل کرتا ہے' جن کو ان آیات مبارکہ کی پہلی آیت میں "اولوا الالباب" قرار دیا گیا ہے' یعنی ہوشمند لوگ' عقل سے کام لینے والے لوگ' صاحبِ خرد لوگ۔ ان لوگوں کے متعلق فرمایا گیا ہے :

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ○﴾

"یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں نشانیاں ہیں ہوشمند اور باشعور لوگوں کے لئے"......

اولوا الالباب کے ذہنی و شعوری سفر کے ارتقائی مراحل

قارئین کرام ان آیات مبارکہ کے ترجمے پر ایک نگاہ ڈال لیں تو یہ نکات ان کے سامنے آئیں گے کہ اس رکوع کی پہلی پانچ آیات میں "اولوا الالباب" کے بارے میں

اولین بات یہ سامنے آتی ہے کہ یہ لوگ کتابِ فطرت کے مطالعے اور مظاہرِ فطرت کے مشاہدے سے اللہ کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔ ان کے ذہنی اور شعوری سفر کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اللہ کو پہچان لینے کے بعد اس کی ذاتِ اقدس سے ایک مضبوط ذہنی رشتہ و تعلق استوار کر کے مزید غور و فکر کرتے ہیں اور بقول علامہ اقبال خرد کی مزید گتھیاں سلجھاتے ہیں تو ان کی رسائی ایمان بالمعاد یعنی ایمان بالآخرۃ تک ہو جاتی ہے۔ گویا معرفتِ الٰہی اور مکافات و مجازاتِ عمل اور اس کے لئے ایک دوسری زندگی کے منطقی لزوم تک رسائی ان کے اپنے مطالعہ و مشاہدہ اور تعقل و تفکر کا حاصل ہوتی ہے۔ اس ارتقائی عمل کا تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جب کسی نبی کی دعوت ایسے لوگوں کے کانوں میں پڑتی ہے جو ان ہی امور پر مشتمل ہوتی ہے تو وہ والہانہ انداز میں اس پر لبیک کہتے ہیں۔

اس سبق کی آخری آیت یعنی آیت نمبر۱۹۵ میں ایسے لوگوں کی سیرت و کردار کی ایک جھلک دکھادی گئی ہے کہ یہ لوگ بودے اور بزدل نہیں ہوتے بلکہ جہاں عقل و شعور کے اعتبار سے پختہ ہوتے ہیں وہاں ان کا کردار اور ان کی سیرت بھی بہت مضبوط ہوتی ہے۔ چنانچہ جس بات کو عقل و فطرت اور ذہن و قلب سے حق سمجھ کر قبول کرتے ہیں اس کے لئے مال و منال' اہل و عیال' اعزّہ و احباب سب کچھ چھوڑنے حتیٰ کہ جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے ہر دم تیار رہتے ہیں اور وقت آنے پر بالفعل جان و مال کی بازیاں کھیل کر دکھاتے ہیں!

اس درس کے ضمن میں تیسری اور آخری تمہیدی بات یہ ہے کہ اس کا ہمارے سابقہ دروس سے ربط و تعلق یہ ہے کہ اس سلسلۂ دروس کے نقطۂ آغاز یعنی سورۃ العصر میں انسان کی نجات اور فوز و فلاح کی چار ناگزیر شرائط سامنے آئی تھیں ـــــ ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ یہی مضمون اپنی پوری جامعیت کے ساتھ مگر قدرے مختلف سیاق و سباق میں وارد ہوا تھا آیۂ بِر میں بھی اور سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں بھی۔ اس تناظر میں یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان چار لوازمِ نجات میں سے ایمان اور صبر یعنی پہلی اور آخری شرائط کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ گویا درمیانی دو شرائط یہاں مقدر ہیں۔ پھر سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں حضرت لقمان کی شخصیت سامنے آچکی

ہے جو نہ نبی تھے اور نہ ہی کسی رسول کے امتی تھے، لیکن فطرتِ سلیمہ اور عقلِ صحیح کی رہنمائی میں وہ ایمان باللہ، التزامِ توحید اور اجتناب عن الشرک کے علاوہ قانونِ مجازات و مکافاتِ عمل تک بھی پہنچ گئے تھے۔ یہی مضمون سورۃ الفاتحہ میں سامنے آچکا ہے کہ ایک سلیم الفطرت اور صحیح العقل انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی حاصل کرلیتا ہے اور اسے جزاو سزا کا شعور بھی حاصل ہو جاتا ہے، لیکن پھر وہ زندگی کے پیچیدہ مسائل ومعاملات میں تفصیلی رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے، جس کے لئے وہ اپنے رب کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے کہ اے ہمارے رب اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ "ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما!" یہاں سے رسالت کی ضرورت کی دلیل قائم ہوتی ہے۔

سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی پہلی پانچ آیات اس اعتبار سے قرآن حکیم کے اہم ترین مقام کی حیثیت رکھتی ہیں کہ ان میں عقل وفطرت کی رہنمائی میں توحید اور معاد تک رسائی کے تدریجی عمل کے ان منطقی اور ارتقائی مراحل کا بیان نہایت اجمال کے ساتھ آگیا ہے جو قرآن حکیم کی مکی سورتوں میں شرح وبسط کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

زیرِ مطالعہ آیات کے بارے میں بعض تمہیدی باتوں کے بیان کے بعد اب ہمیں ان آیاتِ مبارکہ پر ذرا گہرائی میں غور وفکر کرنا ہے۔ اولاً ہم اپنی توجہات کو صرف تین آیات پر مرکوز رکھیں گے۔ اس کے لئے مناسب ہے کہ پہلے ان آیات کا ترجمہ ذہن نشین کرلیا جائے جو حسب ذیل ہے:

"یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں ہوش مند وباشعور لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ وہ لوگ جو بیٹھے اور کھڑے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد رکھتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور وفکر کرتے ہیں (وہ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ) اے رب ہمارے! تو نے یہ سب کچھ بیکار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ تو اس سے پاک ہے (کہ کوئی کام بیکار اور بے مقصد کرے!) پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ اے رب ہمارے! بے شک جسے تو نے آگ میں داخل کیا اسے تو تُو نے پوری طرح رسوا کردیا۔ اور ایسے ظالموں کا

یقیناً کوئی مددگار نہیں۔"

"اولوالالباب" کون ہیں؟

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ ان آیاتِ مبارکہ میں ایمان کی "ترکیب" کا بیان ہو رہا ہے، لیکن عوام کے تقلیدی ایمان کا نہیں بلکہ ہوش مند اور صاحب عقل و شعور لوگوں کے اکتسابی اور شعوری ایمان کا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی آیت میں "اولی الالباب" کی اصطلاح وارد ہوئی ہے، یعنی "الباب والے"۔ "الباب" جمع ہے "لُبّ" کی۔ لُب کسی چیز کے اصل جوہر کو کہتے ہیں۔ چنانچہ ہم عام بول چال والی اردو میں بھی کہتے ہیں کہ "پوری بحث کا لُبِّ لباب یہ ہے"۔ گویا کسی شے کا اصل جوہر اس کا "لُب" کہلاتا ہے۔ اب غور کا مقام ہے کہ انسانیت کا اصل جوہر کیا ہے؟ آپ کو معلوم ہو گا کہ اہل منطق اور اہل فلسفہ نے انسان کو "حیوانِ عاقل" قرار دیا ہے۔ لہٰذا انسان کا خلاصہ اور اس کا اصل جوہر یا بالفاظ دیگر اس کا لُبِّ لباب اس کی عقل ہے۔ پس اس آیتِ مبارکہ میں "اولی الالباب" سے وہ ہوش مند اور باشعور لوگ مراد ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں اور خواہشات و شہوات کی بجائے عقل کی پیروی کرتے ہیں۔

فہم قرآن کا ایک اہم اور سنہری اصول یہ ہے کہ قرآن مجید کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے۔ چنانچہ اس اصول کو سامنے رکھ کر جب ہم نگاہ دوڑاتے ہیں تو عجب حسنِ اتفاق سامنے آتا ہے کہ یہ آیت مبارکہ سورۂ آل عمران کے بیسویں رکوع کی پہلی آیت ہے اور سورۃ البقرہ کے بیسویں رکوع کی پہلی آیت میں بھی یہی مضمون بڑی تفصیل سے آیا ہے۔ سورۃ البقرہ کی اس آیت کو اگر "آیۃ الآیات" سے موسوم کیا جائے تو نہایت مناسب ہو گا۔ اس لئے کہ اس ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی متعدد نشانیاں جمع فرمادی ہیں اور مظاہر فطرت کی ایک طویل فہرست بیان فرمادی ہے۔

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ

بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾ (البقرہ : ۱۶۴)

"یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور اس کشتی میں جو سامان کو دریا میں لے کر چلتی ہے جس سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہے اور وہ پانی کہ جو اللہ نے بلندی سے برسایا اور اس کے ذریعے سے زمین کو مُردہ ہو جانے کے بعد از سرِنو زندہ کیا اور اس میں ہر قسم کی جاندار چیزوں کو پھیلا دیا' اور ہواؤں کے چلنے میں اور اس بادل میں جو آسمان اور زمین کے مابین معلق ہے' نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔"

دیکھئے یہاں آخر میں الفاظ آئے "لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ" جبکہ سورۂ آل عمران میں الفاظ آئے : "لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ" ــــــ معلوم ہوا کہ اولوا الالباب وہ لوگ ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں ــــــ جن کی عقل پر جذبات و شہوات اور تعصبات کے پردے نہیں پڑے ہوتے ــــــ جو تفکر و تدبر کرتے ہیں اور جن کا شعور بیدار ہوتا ہے۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ ہر معاشرے میں اور ہر دور میں انسانوں کی عظیم اکثریت تو ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جنہیں اگر "ٹانگوں پر چلنے والا حیوان" قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس لئے کہ وہ جس ماحول میں آنکھیں کھولتے ہیں وہاں جو کچھ ہوتا دیکھتے ہیں وہی خود بھی کرنے لگتے ہیں۔ ان کی اپنی آزاد فکر اور سوچ نہیں ہوتی۔ وہ غور ہی نہیں کرتے کہ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ ہماری زندگی کا مآل کیا ہے؟ مبدء کیا ہے؟ معاد کیا ہے؟ شر کیا ہے؟ علم کے قابلِ اعتماد ذرائع کون سے ہیں؟ اور اس زندگی کا مقصد کیا ہے؟ لیکن ہر دور اور ہر معاشرے میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کا مزاج تقلیدی نہیں ہوتا۔ جو خود سوچتے ہیں اور خود کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فلسفہ اور مذہب کے مابین جو اصل اور بنیادی سوالات مشترک ہیں' وہ ان کے بارے میں تفکر و تدبر اور غور و خوض کرتے ہیں۔ گویا وہ زندگی کا راستہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر طے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اولوا الالباب ہیں' ہوش مند ہیں' باشعور ہیں۔ یہ کسی سوسائٹی کی ذہین و فطین اقلیت ہوتے ہیں۔ اس آیت مبارکہ میں فرمایا جا رہا ہے (ترجمہ) "یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں نشانیاں ہیں ہوش مند اور

باشعور لوگوں کے لئے "۔ یعنی اگر یہ لوگ کتابِ فطرت کا مطالعہ کریں تو انہیں کائنات میں ہر چہار طرف نشانیاں نظر آئیں گی۔ نشانیاں کس کی؟ اس کی صراحت نہیں کی گئی۔ مراد ہے اللہ کی نشانیاں۔ یعنی کتابِ فطرت کا مطالعہ اور مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ ایمان باللہ کے ذرائع ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ہر چیز ذاتِ باری تعالیٰ اور اس کی توحید کی نشانی ہے۔

"آیت" کا مفہوم

اس مرحلے پر "آیت" کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے۔ آیت کے لغوی معنی ہیں "نشانی"۔ اب غور کیجئے کہ ہم "نشانی" کسے کہتے ہیں! کسی شے یا کسی شخص یا کسی ہستی کی نشانی وہ ہے کہ جس کو دیکھتے ہی ذہن بے اختیار اور بلاارادہ اس شے یا شخص یا ہستی کی طرف منتقل ہو جائے۔ فرض کیجئے کہ آپ کے پاس آپ کے کسی دوست کی ایک نشانی تھی۔ بہت عرصہ سے آپ کی اپنے اس دوست سے ملاقات نہیں ہوئی' نہ کسی نوع کا ربط و تعلق رہا۔ اب آپ کا وہ دوست آپ کی یادداشت کے انبار میں گم ہو گیا ہے یا اس کی یاد شعور کی سطح سے محو ہو چکی ہے۔ لیکن کسی روز آپ کو اپنے سوٹ کیس یا کسی دوسرے سامان میں وہ رومال یا قلم یا کوئی دوسری چیز اچانک نظر آ جاتی ہے جو آپ کے دوست نے اپنی نشانی کے بطور آپ کو دی تھی۔ اس نشانی کو دیکھتے ہی دفعۃً آپ کو اپنا وہ دوست یاد آ جاتا ہے۔ یہ ہے نشانی کا حقیقی مفہوم اور اس کی اصل غایت۔ قرآن مجید کے نزدیک اس کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کی نشانی ہے۔ یہ نشانیاں آفاق میں بھی ہیں اور انفس میں بھی۔ گویا یہ نشانیاں کائنات میں بھی ہر چہار طرف پھیلی ہوئی ہیں اور خود ہمارے اندر بھی موجود ہیں۔ جیسے کہ قرآن حکیم میں ایک مقام پر فرمایا : "سَنُرِیۡھِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِھِمۡ" (ترجمہ) "ہم عنقریب انہیں دکھلائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور خود ان کے اپنے وجود میں بھی" (سورۂ حٰم السجدہ:۵۳) گویا اس کائنات کی وسعت اور انسان کے اپنے وجود کے باطن میں اَن گنت اور بے شمار نشانیاں اللہ کی موجود ہیں جن کو دیکھ کر اور جن پر غور و فکر کے نتیجے میں ایک صاحب عقل و خرد کو اللہ یاد آ سکتا ہے اور اس کی معرفت اس کے اپنے قلب کی گہرائیوں سے ابھر کر اس کے شعور پر جلوہ آرا ہو سکتی ہے!

قرآن کا طرزِ استدلال

یاد رکھئے کہ قرآن مجید ایمان باللہ اور معرفتِ خداوندی کے لئے اہلِ منطق کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔ وہ اللہ کی ہستی کے اثبات کے لئے منطقی دلائل نہیں دیتا' بلکہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' قرآن حکیم بدیہیاتِ فطرت پر اپنے استدلال کی بنیاد قائم کرتا ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ جیسے کسی نشانی کو دیکھ کر بے اختیار اور بلا ارادہ کوئی یاد آجاتا ہے ایسے ہی اس کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کی نشانی ہے۔ اس کو دیکھ کر ایک سلیم الفطرت انسان کو اللہ یاد آجاتا ہے اور مزید غور و فکر سے اس کی تفصیلی معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر آپ اسے کسی درجہ میں منطق کا جامہ پہنانا چاہیں اور اس کی کوئی عقلی توجیہہ کرنا چاہیں تو اس کا تجزیہ یوں ہو گا کہ یہ وجود' یہ سلسلۂ کون و مکان عقلاً مستلزم ہے ایک خالق کا۔ کوئی تو پیدا کرنے والا اور بنانے والا ہونا چاہئے۔ آپ سے آپ تو کوئی چیز وجود میں نہیں آتی۔ کوئی ہستی ہے جس نے اس کائنات کو وجود بخشا ہے۔ گویا یہ کائنات کا وجود خود ہی خالق کے وجود کے لئے دلیل ہے۔ البتہ یہ قطعی و حتمی دلیل نہیں ہے۔ اس لئے کہ جیسے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اسی طرح منطق خود منطق کو کاٹتی ہے۔ خالص منطق اس کا تقاضا کرے گی کہ خالق کا وجود ثابت کرنے کے لئے پھر ایک خالق کا وجود ہونا چاہئے۔ اس طرح یہ سلسلہ لامتناہی ہو گا' کیونکہ ایک خالق کے وجود کو ثابت کرنے کے بعد بھی یہ سوال باقی رہے گا۔ لہٰذا ہمارے بہت سے متکلمین نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ محض منطق سے وجود باری تعالیٰ کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سبب ہے اس امر واقعہ کا کہ قرآن مجید وجود باری تعالیٰ کے اثبات کے لئے منطقی طرز استدلال اختیار نہیں کرتا' بلکہ اپنے استدلال کی بنیاد بدیہیاتِ فطرت پر رکھتا ہے۔ وجود باری تعالیٰ کا علم فطرتِ انسانی میں ودیعت شدہ ہے۔ ایک سلیم الفطرت اور صحیح العقل انسان فطرت کی بنیاد پر جس چیز کو جانتا اور مانتا ہے اس میں عقلی مسلّمات کے اضافے سے حکمتِ قرآنی کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔ الغرض جہاں تک وجودِ باری تعالیٰ کا تعلق ہے' اس کا ادراک تو ایک سلیم الفطرت انسان کے قلب کی گہرائیوں سے از خود ابھرتا ہے یا آفاقی و انفسی آیات کی تحریک سے اجاگر ہو کر شعور کی سطح پر جلوہ آرا ہوتا

ہے۔ تاہم آیاتِ الٰہی پر غور و فکر کے نتیجے میں ایک سلیم العقل انسان کو اس واجب الوجود ہستی کی بنیادی صفات کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

چنانچہ اولاً جب وہ مظاہر فطرت میں کامل توافق اور حد درجہ ہم آہنگی دیکھتا ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ پورا نظام کسی ایک ہی خالق کی تخلیق ہے اور وہی اس کا واحد مدبّر و منتظم بھی ہے۔ اس لئے کہ اگر اس تخلیق و تدبیر کے عمل میں ایک سے زائد ذہن یا ارادے اور مشیتیں یا اختیارات کار فرما ہوتے تو اس عظیم اور لامتناہی کائنات میں کبھی نظم اور ضبط برقرار نہ رہ سکتا۔

اولوالالباب کے غور و فکر کا حاصل : معرفتِ رب

اسی رخ پر مزید غور و فکر سے ان ہوش مند اور باشعور لوگوں کو اس خالق کائنات اور مدبّر و منتظمِ حقیقی کی تین اساسی صفات کمال کا علم ہوتا ہے ـــــ یعنی ایک یہ کہ وہ ہر چیز پر قادر گویا "قادرِ مطلق" ہے اور اس کی قدرت سے کوئی شے خارج یا بعید نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ وسیع و عریض کائنات ہرگز وجود میں نہ آسکتی جس کی وسعتوں اور پہنائیوں کا تاحال کوئی اندازہ انسان نہیں کر پایا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کائنات کو پیدا کرنے والا "بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ" یعنی ہر چیز کا جاننے والا بھی ہے اور اس کے علم میں کہیں کوئی کمی اور نقص نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ جس نے کسی چیز کو پیدا کیا ہو وہ اس سے بے خبر یا ناواقف ہو، جیسے کہ سورۃ الملک میں فرمایا : "اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ" یعنی "کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا؟ وہ تو نہایت باریک بین بھی ہے اور حد درجہ باخبر بھی!" تیسرے یہ کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا ایک حکیمِ کامل بھی ہے، اس لئے کہ اس نے جو کچھ تخلیق فرمایا ہے، اس میں ہر چیز حکمت سے پُر ہے اور کوئی چیز بے مقصد اور بلاغایت نہیں ہے، حتیٰ کہ گھاس کا ایک تنکا بھی بے کار اور عبث نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کائنات کے مشاہدے اور اس پر غور و فکر کے نتیجے میں ایک ہوش مند اور باشعور انسان کا ذہن وجودِ باری تعالیٰ اور اس کی صفاتِ کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ یہی مفہوم ہے سورۂ آل عمران کے بیسویں رکوع کی پہلی اور مختصر آیت

اور سورۃ البقرہ کے بیسویں رکوع کی پہلی اور طویل آیت کا جس کا میں نے پہلے حوالہ دیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی پہلی آیت کے مطابق مظاہرِ فطرت پر تفکر و تدبر کے نتیجے میں ایک ہوش منداور باشعور انسان کے ہاتھ میں اس کائنات کی گتھی سلجھانے کے لئے الجھی ہوئی ڈور کا جو سرا آتا ہے وہ ہے معرفتِ رب' یعنی اس حقیقت کا شعور وادراک کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے جو اپنی ذات میں یکہ و تنہااور بے مثل اور بے نظیر بھی ہے اور کمالِ علم' کمالِ قدرت اور کمالِ حکمت سے متصف بھی۔ ابھی اس الجھی ہوئی ڈور کو مزید سلجھانا ہے تو لازم ہے کہ وہ ہوشمند اور باشعور انسان الجھی ہوئی ڈور کے اس سرے کو ہاتھ سے نہ چھوڑے' ورنہ ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔ چنانچہ یہی ربط ہے کہ اگلی آیت میں ان دانشمند لوگوں کا یہ وصف بیان ہوااور ان کی کیفیت کا یہ نقشہ کھینچا گیا کہ :

﴿ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾

"وہ لوگ جو اللہ کو یاد رکھتے ہیں کھڑے ہوئے بھی' بیٹھے ہوئے بھی اور اپنے پہلوؤں کے بل لیٹے ہوئے بھی' اور (مزید) غور و فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں۔"

ان الفاظِ مبارکہ کا مفہوم و مدّعا یہ ہوا کہ جب ان اولوا الالباب نے کتابِ فطرت کے مطالعے' مظاہرِ قدرت کے مشاہدے اور اپنے غور و فکر اور تعقل و تفکر سے اللہ کو پہچان لیا تو پھر وہ ہر دم اور ہر لحظہ اللہ کو یاد رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے ذہن و قلب میں ہر آن مستحضر رہتا ہے (اس لئے کہ ذکر اللہ کے معنی "استحضار اللہ فی القلب" ہیں' یعنی دل میں اللہ کی یاد موجود رہے) اور اس سرے کو مضبوطی کے ساتھ ہاتھ میں تھام کر وہ کائنات کے "معمے" کو مزید حل کرنے اور اس الجھی ہوئی ڈور کو مزید سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور و فکر اور تعقل و تفکر کا عمل جاری رکھتے ہیں!

"ذکر و فکر" کا باہمی ربط و تعلق

آگے بڑھنے سے قبل توجہ کو ذرا ادھر مبذول کر لیا جائے تو مناسب ہو گا کہ یہاں "ذکر و فکر" جس طرح یکجا صورت میں سامنے آئے ہیں اس کی بڑی اہمیت ہے' کیونکہ انسان کے غور و فکر کا عمل صحیح رخ پر اسی وقت آگے بڑھے گا جب یہ دونوں چیزیں بیک وقت موجود ہوں' اس لئے کہ یہ دونوں ایک گاڑی کے دو پہیّوں کی مانند ہیں۔ گاڑی ایک پہیئے پر نہیں چلے گی بلکہ اس کے دونوں پہیوں کو لامحالہ حرکت کرنا ہو گی۔ گویا ذکر بھی ہو اور فکر بھی ہو' یہ دونوں ضروری اور لازمی ہیں۔ بد قسمتی سے ہمارا موجودہ المیہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں دو حلقے جدا جدا ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو ذکر کے تو لذّت آشنا ہیں لیکن فکر کے میدان میں قدم نہیں رکھتے' جبکہ کچھ لوگ وہ ہیں جو غور و فکر کی وادی میں تو سرگرداں رہتے ہیں لیکن ذکر کی لذت سے محروم رہتے ہیں' گویا دونوں چیزیں علیحدہ علیحدہ ہو گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مطلوبہ نتائج پیدا نہیں ہو رہے۔ مولانا رومؒ نے اس حقیقت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

این قدر گفتیم باقی فکر کُن!
فکر اگر جامد بود رو ذکر کُن!

"اتنا تو ہم نے تمہیں بتا دیا' آگے خود سوچو' غور و فکر کرو اور اگر فکر میں کہیں رکاوٹ پیدا ہو جائے اور تم محسوس کرو کہ وہ جامد ہو رہا ہے تو جاؤ اور مزید ذکر کرو"۔ آگے فرماتے ہیں۔

ذکر آرد فکر را در اہتزاز
ذکر را خورشید این افسردہ ساز

"اس ذکر سے فکر میں ایک حرکت تازہ پیدا ہو گی اور وہ صحیح رُخ اور صحیح سمت میں آگے بڑھے گا۔ ذکر تو آفتاب کے مانند ہے' وہ فکر کی افسردگی کو دور کرے گا۔"

یہی بات علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے کہی ہے۔

جز بہ قرآں ضیغمی روباہی است
فقرِ قرآں اصل شاہنشاہی است

نقرِ قرآں؟ اختلاطِ ذکر و فکرا
فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکرا

"قرآن کے بغیر شیر بھی گیدڑ بن جاتا ہے۔ اصل شاہنشاہی قرآن کے تعلیم کردہ فقر میں ہے۔ جانتے ہو فقرِ قرآنی کیا ہے؟ یہ ذکر و فکر دونوں کے مجموعے سے وجود میں آتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ ذکر کے بغیر فکر مکمل نہیں ہو سکتا۔"

آیت زیرِ مطالعہ میں ذکر کی اہمیت کو انسان کی ان تین حالتوں کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے جن سے وہ امکانی طور پر دوچار رہتا ہے' یعنی کھڑے ہوئے جس میں چلنا آپ سے آپ شامل ہے۔ بیٹھے ہوئے جس میں مشغول ہونا بھی شامل ہے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے جس میں نیند اور بیداری دونوں صورتوں کی استراحت شامل ہے۔ گویا یہ اولوا الالباب اللہ کی یاد کا ہر حال میں اہتمام والتزام کرتے ہوئے کائنات کے عقدے کو حل کرنے کے لئے غور و فکر جاری رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں ذکر سے مراد یہ ہے کہ زبان سے اللہ کی تحمید' تسبیح' تہلیل اور تمجید کے کلماتِ مسنونہ کی ادائیگی بھی جاری رہے اور دل میں اللہ کے حاضر و ناظر' سمیع و بصیر' علیم و خبیر اور حفیظ و رقیب (نگران) ہونے کا یقین بھی موجود رہے۔ اور اس کیفیت کے دوام کے ساتھ ہی وہ کائنات کی تخلیق میں غور و فکر بھی کرتے رہتے ہیں۔

عقل و فطرت کا ایک تقاضا: مکافاتِ عمل

ذکر و فکر کے اس اختلاط سے وہ اولوا الالباب جس نتیجے تک پہنچتے ہیں اس کو آگے بایں الفاظ بیان فرمایا:

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ' سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾

(وہ پکار اٹھتے ہیں کہ) "اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد (بلاغایت اور بیکار) پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے' (منزہ ہے' اعلیٰ ہے' ارفع ہے اس سے کہ کوئی کارِ عبث کرے) پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔"

یہاں قدرے تشریح و توضیح کی ضرورت ہے۔ ان اولوا الالباب کے سامنے ان کے ذکر و فکر کے نتیجے میں جو حقیقتِ کبریٰ پورے جزم و یقین کے ساتھ ابھر کر آتی ہے وہ یہ ہے کہ

جب اس کائنات کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی بے مقصد پیدا نہیں کی گئی ہے تو کیسے ممکن ہے کہ یہ کُل کائنات بحیثیتِ مجموعی اور خاص طور پر اس کا نقطہ عروج یعنی انسان بے مقصد پیدا کیا گیا ہو اور اس کے افعال و اعمال کا کوئی نتیجہ نہ نکلے؟ چنانچہ یہیں سے ان کا ذہن مجازات و مکافاتِ عمل اور جزا و سزا کے تصور کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یاد ہو گا کہ یہ بات اس سے قبل سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحت کے ضمن میں آ چکی ہے:

﴿يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ﴾

"اے میرے بچے' (اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ انسان کا کوئی عمل خواہ نیکی کا ہو یا بدی کا) خواہ وہ رائی کے دانے کے برابر ہو' پھر خواہ وہ کسی چٹان کے پیٹ میں گھس کر کیا گیا ہو' خواہ آسمان کی پہنائیوں میں خواہ زمین کی وسعتوں میں' اللہ اسے لا حاضر کرے گا......."

لہٰذا عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ع "گندم از گندم بروید جو ز جو" کے مصداق نیکی کے نتائج اچھے نکلیں اور بدی کے نتائج برے نکلیں۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں اکثر و بیشتر معاملہ الٹا ہوتا ہے۔ چنانچہ نیکوکاروں کے لئے یہاں مصائب و تکالیف ہیں اور بدکاروں اور حرام خوروں کے لئے عیش و آرام! آپ ذرا سی دیر کو فیصلہ کر کے دیکھ لیجئے کہ مجھے کسی حال میں جھوٹ نہیں بولنا۔ معلوم ہو گا کہ زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ اسی طرح ذرا حرام و حلال کی حدود پر کاربند ہونے کا فیصلہ کر کے دیکھ لیجئے' دو وقت کے کھانے کے لالے پڑ جائیں گے۔ اس کے برعکس جن لوگوں کے نہ کچھ اصول ہیں' نہ مستقل اقدار ہیں' نہ ہی وہ کسی قسم کی اخلاقی حدود و قیود کے پابند ہیں' بلکہ ان کو جہاں بھی موقع ملتا ہے وہ دست درازی سے نہیں چوکتے' ان کے یہاں عیش و آرام ہے' ان کے اور ان کے اہل و عیال کے لئے تمام دنیوی سہولتیں وافر مقدار میں مہیا ہیں۔ ان حقائق و واقعات کے مشاہدے سے ہر باشعور اور حساس انسان کے ذہن میں چند سوالات ابھرتے ہیں کہ آیا یہ دنیا اور اس کی تخلیق ناقص ہے؟ یا یہ خیال کہ "نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے" صرف ہمارے ذہن کی اختراع ہے جس

کا حقیقتِ نفس الامری سے کوئی تعلق نہیں؟

ایک سلیم الفطرت اور صحیح العقل انسان ان سوالات پر جس قدر غور کرتا ہے' اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک جانب اس کی عقل پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ عظیم کائنات ایک علیم و خبیر' عزیز و قدیر اور حلیم و دانا ہستی کی سنجیدہ اور بامقصد تخلیق ہے ــــــ اور دوسری جانب اس کی فطرت یہ قطعی اور حتمی فیصلہ کرتی ہے کہ نیکی و بدی اور خیر و شر کی اقدار حقیقی و واقعی بھی ہیں اور مستقل اور پائیدار بھی۔ گویا نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے اور دونوں ہرگز برابر نہیں ہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی : وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ" ہرگز برابر نہیں ہے نہ نیکی اور نہ بدی!"

الغرض عقل اور فطرت دونوں کا تقاضا ہے کہ دنیا کی اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہونی چاہئے جس میں اخلاقی نتائج بھرپور طور پر برآمد ہوں' چنانچہ نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا بھرپور صلہ ملے اور بدکاروں کو ان کی بدی کی بھرپور سزا ملے۔ یہ بات سورۃ القلم میں بایں الفاظِ مبارکہ فرمائی گئی :

﴿اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ ۝ مَا لَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ ۝﴾

"کیا ہم فرماں برداروں اور مجرموں کو برابر کر دیں گے؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے تم کیسی (غیر معقول) رائے قائم کر رہے ہو!"

چنانچہ یہ ہے ایمان باللہ سے ایمان بالآخرۃ تک کا عقلی سفر کہ جب اولوا الالباب اللہ کو یاد رکھتے ہوئے تخلیقِ کائنات پر غور و فکر کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہاں کوئی شے بے مقصد' بے کار' عبث اور بلاغایت نہیں ہے تو پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ ہماری فطرت اور ہمارے باطن میں نیکی اور بدی اور برّ و تقویٰ اور فسق و فجور کا جو شعور موجود ہے وہ بے نتیجہ اور لاحاصل رہے۔ اس دنیا میں ان کا منطقی اور معقول نتیجہ نہیں نکل رہا' لہٰذا لازماً ایک دوسری زندگی ہونی چاہئے جس میں نیکی اور بدی کے بھرپور نتائج برآمد ہوں' نیکوکاروں کو جزا اور بدکاروں کو سزا ملے۔ جب یہ لوگ اس عقلی نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں تو وہ اللہ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر استدعا کرتے ہیں کہ

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ رَبَّنَا اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۚ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ○﴾

"اے رب ہمارے! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے (کہ کوئی عبث کام کرے) پس اے رب ہمارے! تو ہمیں (آخرت میں) آگ کے عذاب سے بچائیو۔ (اس آخرت کی زندگی میں) جسے بھی تو نے آگ میں جھونک دیا اسے تو بدرجہ کامل ذلیل و رسوا کر دیا اور (ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ وہاں) ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہو گا۔"

حاصل کلام یہ کہ ان آیات میں خلاصہ ہے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے عقلی سفر کا۔ یہ قرآن حکیم کا وہ مظہری استدلال ہے جو قرآن مجید کی طویل مکی سورتوں میں تو نہایت شرح و بسط کے ساتھ طویل مباحث کی صورت میں سامنے آتا ہے لیکن اِس مقام پر ان تین آیات میں جس جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے اس کی کوئی دوسری نظیر میرے محدود مطالعے کی حد تک قرآن حکیم میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ان آیاتِ مبارکہ کی عظمت و جامعیت کا بیان ایک مختصر صحبت میں قطعاً ممکن نہیں ہے' تاہم امید ہے کہ ان گزارشات کے ذریعے ان کے جلال و جمال کی ایک ادنیٰ جھلک ضرور سامنے آگئی ہو گی اور اصولاً یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہو گی کہ اللہ پر ایمان اور آخرت پر ایمان کے ضمن میں قرآن حکیم کا اپنا مخصوص طرزِ استدلال کیا ہے اور وہ تلاش حق کے ضمن میں غور و فکر کے لئے کون سا راستہ تجویز کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس راہ سے یقین محکم عطا فرمائے۔

شعوری ایمان اور اس کے لوازم

مذکورہ بالا تین آیات (۱۹۰ تا ۱۹۲) کے بارے میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا قول جو نہ صرف ایک بہت بڑے عالم' محقق اور مفسر تھے بلکہ نہایت عظیم مجاہد اور مردِ میدان بھی تھے' یہ ہے کہ ان میں "ایمانِ عقلی" کا بیان ہے۔ یعنی ایک سلیم الفطرت انسان

جب اپنی عقلِ صحیح کی رہنمائی میں ذہنی و فکری سفر طے کرتا ہے تو کتابِ فطرت کے مطالعے اور مظاہرِ قدرت کے مشاہدے اور اپنے تعقل و تدبّر اور تذکر و تفکر سے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ تک رسائی حاصل کرلیتا ہے۔ اب ہم اس سبق کی بقیہ تین آیات (۱۹۳ تا ۱۹۵) کا مطالعہ کرتے ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کے قول کے مطابق ان میں سے پہلی آیت (۱۹۳) میں "ایمان سمعی" کا ذکر ہے۔ یعنی وہ اولوا الالباب جو اپنے ذہنی و فکری سفر کے نتیجے میں اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے جب ان کے کانوں تک کسی نبی کی دعوت پہنچتی ہے جو انہی امور پر مشتمل ہوتی ہے کہ مانو اس حقیقت کو کہ اس کائنات کا ایک خالق و مالک ہے جو ہر چیز پر قادر بھی ہے اور ہر چیز کا علم بھی رکھتا ہے' وہ العزیز بھی ہے اور الحکیم بھی ——— اور مانو اس حقیقت کو کہ انسان کی زندگی صرف اِس دنیا کی زندگی نہیں ہے اور موت زندگی کے خاتمے کا نام نہیں ہے بلکہ ؎

"موت اِک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دَم لے کر!"

کے مصداق اصل زندگی تو موت کے بعد شروع ہوگی۔ از روئے الفاظ قرآنی : "وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ' لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ" (العنکبوت : ۶۴) یعنی "اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے' کاش کہ انہیں معلوم ہوتا"۔ اس زندگی میں اس دنیا کی زندگی کے اعمال کے بھرپور نتائج نکلیں گے' چنانچہ یا ابدی عیش و آرام ہوگا یا ہمیشہ کی عقوبت و عذاب۔ ان امور پر مشتمل جب کسی نبی کی دعوت ان اولوا الالباب کے کانوں تک پہنچتی ہے تو فطری اور منطقی طور پر ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ نبی کی دعوت پر والہانہ لبیک کہتے ہیں اور بالکل اس کیفیت کے ساتھ اس کی تصدیق کرتے ہیں جو اس شعر میں سامنے آتی ہے کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

اس موقع پر ان کے احساسات و جذبات کی جو کیفیت ہوتی ہے اسے الفاظ کا جامہ پہنا کر ایک

دعا کی صورت میں ان آیاتِ مبارکہ میں ہمارے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ :

"اے رب ہمارے! ہم نے سنا ایک پکارنے والے کی پکار کو کہ وہ ایمان کی منادی کر رہا ہے کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر' پس ہم ایمان لے آئے' تو اے ہمارے رب (ہماری اب تک کی زندگی میں جو خطائیں ہم سے سرزد ہوئی ہیں اور جو کوتاہیاں صادر ہوئی ہیں ان سے درگزر فرما اور) ہمارے گناہ معاف فرما دے اور (ہمارے دامنِ کردار اور نامہ اعمال کی) برائیوں کو دور فرما دے' اور جب تو ہمیں وفات دے تو اپنے نیکوکار بندوں کی معیت عطا فرمائیو! اور اے رب ہمارے! ہمیں وہ سب کچھ عطا کیجیو جس کا وعدہ تو نے ہم سے اپنے رسولوں کی وساطت سے کیا ہے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو' یقیناً تو اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرنے والا نہیں۔" (آیات ۱۹۳۔۱۹۴)

یہ ایک نہایت عظیم دعا ہے اور عجب حسن اتفاق ہے کہ سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران کے مابین جو بہت سے امور مشابہت کے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ سورۃ البقرہ کے اختتام پر بھی ایک عظیم دعا وارد ہوئی ہے۔ اسی طرح یہ عظیم دعا ہے جو سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں وارد ہوئی ہے۔

اس موقع پر دعا کی حقیقت اور اہمیت کو بھی سمجھ لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ کسی سابقہ درس میں یہ احادیث بیان ہو چکی ہیں کہ دعا عبادت کا جوہر ہے' بلکہ دعا ہی عبادت ہے۔ درحقیقت دعا اس نسبت کو ظاہر کرتی ہے جو بندے اور رب کے مابین ہے اور عبد اور معبود کے مابین تعلق دعا ہی کے ذریعے استوار اور مستحکم ہوتا ہے۔ مزید برآں دعا ایمان اور یقین کا مظہرِ اَتم ہے' اس لئے کہ جب بندہ اللہ سے دعا کرتا ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ اللہ کو سمیع و بصیر اور مجیب الدعوات ہی نہیں' علٰی کلِّ شیءٍ قدیر بھی سمجھتا ہے' تب ہی تو اس سے اپنی حاجت روائی اور مشکل کشائی کی استدعا کر رہا ہے۔

صِدّیقین کے ایمان کی کیفیت

یہاں فلسفہ دین اور حکمتِ قرآن کے اعتبار سے سب سے اہم بات جو ذہن نشین کر لینی چاہئے وہ یہ ہے کہ یہ ہیں وہ لوگ جن کو اصطلاح میں "صِدّیقین" کہتے ہیں' جو نبی کی

دعوت کو قبول کرنے میں والہانہ پیش قدمی کرتے ہیں اور قطعاً کوئی توقف نہیں کرتے۔ گویا انہیں اس کے بارے میں کوئی اشتباہ لاحق ہی نہیں ہوتا' چنانچہ نہ وہ کوئی اعتراض وارد کرتے ہیں' نہ کوئی جرح کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ آپ ہم کو دعوت دینے والے کون ہوتے ہیں؟ بلکہ ان کی کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ جیسے کوئی نمازی وضو کر کے نماز کے لئے تیار بیٹھا ہو اور صرف انتظار کر رہا ہو کہ جیسے ہی اذان کی آواز کان میں پڑے وہ فوراً مسجد کا رخ کرے۔ بالکل یہی کیفیت صِدیقین کی ہوتی ہے' جن کی فطرت صالح ہوتی ہے' جن کی عقل سلیم ہوتی ہے' اور جو خود اپنے ذاتی غور و فکر کے نتیجے میں ان نتائج کے آس پاس پہنچ چکے ہوتے ہیں جن کی دعوت وحی کے ذریعے سے انبیائے کرام اور رُسلِ عِظام علیہم السلام تک پہنچتی ہے اور پھر ان کے ذریعے ان حضرات صدیقین کے کانوں تک پہنچتی ہے۔

الغرض ان صدیقین کو نبی کی دعوت کے قبول کرنے میں نہ کوئی تذبذب' تأمل یا تردد ہوتا ہے نہ کوئی پس و پیش' کیونکہ یہ تو خود ان کی اپنی فطرت کی پکار ہوتی ہے اور ان حقائق پر مشتمل ہوتی ہے جو ان کے اپنے باطن میں مضمر ہوتے ہیں اور وحی کا جامہ پہن کر نبی کے قلبِ اطہر پر وارد ہوتے ہیں اور اب نبی کی زبان سے ایک دعوت کی صورت میں ادا ہو کر ان کے کانوں میں پڑ رہے ہیں' بقول علامہ اقبال مرحوم۔

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے' کیا جانئے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی' دل محفل کا تڑپا بھی گئی!

لہٰذا وہ جس کیفیت کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اس میں ایک والہانہ انداز ہوتا ہے' جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ "میں نے جس کے سامنے بھی دعوت پیش کی اس نے تھوڑی دیر کے لئے کچھ نہ کچھ توقف ضرور کیا' سوائے ابوبکرؓ کے کہ انہوں نے ایک لمحے کا توقف کئے بغیر فوراً میری تصدیق کر دی"۔ اب آپ خود سوچئے کہ ایسا کیوں ہوا؟ معلوم ہوا کہ ان کو ان حقائق کے ادراک' شعور اور پہچاننے میں کوئی دِقت پیش نہیں آئی۔ کون مسلمان ایسا ہو گا جو یہ بات نہ جانتا ہو کہ "واقعہ معراج" کی تصدیق کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ کو بارگاہِ رسالت سے "صِدیق" کا لقب اور خطاب ملا تھا اور پوری امت کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق اکبر ہیں۔ مزید برآں مفسرین کا اس امر پر اجماع ہے کہ سورۃ

الیل کے آخری حصے میں شامل آیات بالخصوص حضرت ابوبکر صدیق ﷛ کی شان میں نازل ہوئی ہیں' چنانچہ امام رازیؒ نے سورۃ الیل کو سورۃ صدیق اکبرؓ قرار دیا ہے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت اگرچہ پورے عرب میں بالعموم شرک اور جہالت کی شدید اور گہری تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں اور مکہ میں تو یہ ظلمت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور عالم یہ تھا کہ دنیا میں خدائے واحد کی عبادت کے لئے جو مرکز تعمیر ہوا تھا وہ اقبال کے ان الفاظ کے مصداق کہ۔

"دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا"

تین سو ساٹھ بتوں کا استھان بنا ہوا تھا اور ہر سو شرک کے گھٹاٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فطرتِ انسانی بالکل مسخ ہو چکی تھی اور توحید کا نور بالکل ہی مٹ چکا تھا۔ اس لئے کہ اسی مکہ کی سرزمین میں عین اسی وقت ابوبکرؓ بھی موجود تھے جنہوں نے ساری عمر کبھی شرک نہیں کیا۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ نبی اکرم ﷺ پر ابھی وحیِ نبوت کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا لیکن جیسے خود نبی اکرم ﷺ پیدائشی طور پر موحّد تھے اسی طرح حضرت ابوبکرؓ بھی پہلے ہی سے موحّد تھے۔ ایسے ہی حضرت عثمان غنی ﷛ بھی ابتدا ہی سے موحّد تھے اور ایسی اور بھی بہت سی مثالیں موجود تھیں۔ ایک صاحب زید بن عمرو بن نفیل تھے جن کا آنحضورؐ پر وحی کے آغاز سے قبل انتقال ہو گیا تھا۔ روایات میں ان کا حال یہ آتا ہے کہ کعبہ شریف کے پردے پکڑ پکڑ کر اللہ سے دعائیں کیا کرتے تھے کہ "اے رب! میں صرف تیری عبادت کرنا چاہتا ہوں' میں ان تمام معبودانِ باطل سے اعلانِ براءت کر رہا ہوں جن کو اہل مکہ پوجتے ہیں اور جن سے انہوں نے تیرے گھر کو آباد کر رکھا ہے' میں صرف تیری ہی پرستش اور صرف تیری ہی پوجا کرنا چاہتا ہوں لیکن میں نہیں جانتا کیسے کروں"...... ان ہی کے صاحب زادے ہیں حضرت سعیدؓ بن زید جو یکے از عشرۂ مبشرہ ہیں اور جو حضرت عمرؓ بن الخطاب کے بہنوئی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ زید جیسے موحد کی آغوش میں تربیت پانے والے کی فطرت میں ان تمام حقائق کا موجود ہونا بالکل سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوںؓ نے حضورؐ پر ایمان لانے میں سبقت کی۔ روایات میں چند اور حضرات کا ذکر بھی ملتا ہے جو اپنی

فطرتِ سلیمہ اور عقل صحیح نیز اپنے غور و فکر سے توحید اور معاد کی معرفت حاصل کر چکے تھے لیکن ان کا انتقال نبی اکرمؐ پر آغازِ وحی سے قبل ہو چکا تھا۔ اس ضمن میں حضرت ورقہ بن نوفل کا ذکر بھی مناسب ہے جو اسی مکہ کی سرزمین میں پیدا ہوئے تھے جہاں شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے' لیکن ان کی فطرتِ سلیمہ نے شرک سے انکار کیا اور انہیں مجبور کیا کہ اس ماحول سے نکل کر حقیقت کی تلاش کریں۔ چنانچہ وہ شام گئے' وہاں انہوں نے عبرانی زبان سیکھی اور عیسائیت اختیار کی اور پھر جب پہلی وحی کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے پاس لے کر گئیں تو انہوں نے فوراً تصدیق کی اور یہ فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوا تھا..... اور کاش کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو ستائے گی اور اس شہر سے نکلنے پر مجبور کر دے گی تو میں آپ کی مدد کر سکوں۔ کچھ ہی دنوں بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

بہرحال یہ ہیں وہ اولوالالباب' ہوش مند اور باشعور لوگ جو ایک جانب تعقل و تفکر کی وادیاں طے کرتے ہیں' اور دوسری جانب ان کی فطرت سلیم ہوتی ہے اور اس میں ودیعت شدہ حقائق روشن ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگ جب انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت سنتے ہیں تو کسی ردّ و قدح کے بغیر فوری طور پر اسے قبول کر لیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال قرآن مجید میں اور بھی ہے۔ ساتویں پارے کی پہلی آیت ہے :

﴿وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝﴾ (المائدہ : ۸۳)

"اور جب انہوں نے سنا جو نازل ہوا ہے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر تو تم دیکھتے ہو کہ (معرفتِ حق کے شدّتِ تاثر کی وجہ سے) ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہہ نکلی ہیں۔ (گویا معرفتِ حق کا اتنا گہرا اثر ان کے قلوب پر ہوا اور جذبات کے اندر وہ کیفیت پیدا ہوئی کہ ان کی آنکھوں سے بے اختیار اشکوں کی جھڑی لگ گئی اور) ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے' پس ہمارا نام بھی حق کے گواہوں میں درج فرما لے۔"

اجابت از درِ حق......

اس کے بعد آیت ۱۹۵ میں بارگاہِ ربّ العزت کی طرف سے اس دعا کی قبولیت کا اعلان ہو رہا ہے اور اس کے ضمن میں ایسے سلیم الفطرت اور سلیم العقل لوگوں کی عملی زندگی اور ان کی سیرت و کردار کی ایک جھلک بھی دکھائی گئی۔ پہلے تو قبولیت و اجابتِ دعا کی بشارت اور نوید بایں الفاظ مبارکہ سنائی گئی : "فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ" "پس ان کے رب' ان کے آقا' ان کے مالک نے ان کی دعا قبول فرمائی۔

یہ بالکل ایسی کیفیت ہے جیسی فارسی کے اس شعر میں بیان ہوئی ہے۔

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

اس شعر کا اردو ترجمہ شعر ہی کی صورت میں کیا گیا ہے۔

ڈرو مظلوم کی آہوں سے جب اٹھتی ہیں سینوں سے
قبولیت ہے کرتی خیر مقدم چرخ سے آ کرا

تو ان صِدّیقین کی دعا کا جواب گویا فوری طور پر مل رہا ہے۔ اِدھر دعا زبان سے نکلی' اُدھر اسے شرفِ قبولیت عطا ہو گیا۔ فرمایا :

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ﴾

"پس ان کی دعا کو قبول فرمایا ان کے رب نے کہ میں تو کسی بھی عمل کرنے والے کے کسی عمل کو ضائع نہیں کرتا خواہ وہ (عمل کرنے والا) مرد ہو' خواہ عورت ہو۔ تم سب ایک دوسرے ہی سے ہو۔"

غور فرمایئے کہ آیت کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں مرد اور عورت کے مابین اخلاقی' دینی اور روحانی مساوات کا اہم اصول بھی بیان فرما دیا گیا کہ دونوں جان لیں کہ اگرچہ تمہاری اصناف جدا جدا ہیں' لیکن یہ جسمانی اور نفسیاتی فرق و تفاوت تو تمدنی ضرورت کے تحت ہے' ورنہ انسان ہونے کے اعتبار سے جیسے تمہاری نوع ایک ہے' اسی طرح سے تمہاری اخلاقی اور دینی حیثیت بھی یکساں اور مساوی ہے۔ دین میں' نیکی میں' خیر

میں اور دین کے ملئے مالی اور جانی قربانیاں دینے میں اور ان کے اجر و ثواب میں مَردوں اور عورتوں میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ مردوں کے لئے بھی میدان کھلا ہے اور عورتوں کے لئے بھی۔ مردوں کے اپنے اعمال ہیں' ان کی اپنی نیکیاں ہیں' ان کی اپنی کمائی ہے اور عورتوں کے اپنے اعمال ہیں' ان کی اپنی نیکیاں ہیں' ان کی اپنی کمائی ہے۔ دونوں کو میری بارگاہ سے ان کے ہر ہر عمل کا بھرپور بدلہ ملے گا۔ میں ان کا چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔

صِدّیقین کے سیرت و کردار کی ایک جھلک

اب اسی آیت کے اگلے حصے کا مطالعہ کیجئے جس کے بارے میں اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اس آیت میں پہلے تو ان صدیقین کو ان کی دعا کی اجابت و قبولیت کی بشارت و نوید سنائی گئی اور پھر افادۂ عام کے لئے ایسے حضرات کی عملی زندگی اور ان کی سیرت و کردار کی ایک جھلک بھی دکھادی گئی :

﴿فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝﴾

"پس وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور جنہیں اس کی راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں اور جنہوں نے جنگ کی اور جنہوں نے اپنی گردنیں کٹوادیں' میں ان کی برائیوں کو لازماً ان سے دور کروں گا اور ان کو لازماً داخل کروں گا ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ یہ بدلہ ہوگا اللہ کے خاص خزانہ فضل سے' اور واقعہ یہ ہے کہ اچھا بدلہ تو اللہ ہی کے پاس ہے۔"

آیت کے اس حصے میں "ہجرت" اور "اخراج من الدیار" کے الفاظ قابل توجہ ہیں۔ بظاہر تو یہ ہم معنی اور ہم مفہوم ہیں' ان کی مراد ایک ہی ہے' لیکن "ہجرت" ہمارے دین کی ایک وسیع المفہوم اصطلاح ہے۔ اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اللہ کے دین کی خاطر گھربار' اہل و

عیال اور اعزہ واقارب سب چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے جانا جہاں عبادتِ رب کا فریضہ انجام دینے میں غیر معمولی اور ناقابل برداشت مشکلات نہ ہوں۔ لیکن اس کے دوسرے بھی متعدد مفاہیم ہیں۔ جیسے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا : "اَیُّ الْھِجْرَۃِ اَفْضَلُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ" (اے اللہ کے رسول ﷺ یہ فرمایئے کہ سب سے اعلیٰ و افضل ہجرت کونسی ہے؟) اب جواب سنئے 'حضورؐ ارشاد فرماتے ہیں کہ "اَنْ تَھْجُرَ مَا کَرِہَ رَبُّکَ" (یہ کہ تو ہر اس چیز کو چھوڑ دے اور ہر اس کام سے اجتناب کرے جو تیرے رب کو پسند نہیں ہے۔) (رواہ النسائی : عن عبداللہ بن عمروؓ) للذا یہاں اس لفظ کو اس کے عموم پر رکھا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ اس طرح "فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا" کا مفہوم ہو گا کہ "وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی خاطر ہر اُس چیز کو تج دیا اور ہر اس چیز سے ترکِ تعلق کر لیا جو اللہ کو پسند نہیں"۔ کوئی چیز ان کے لئے راہ حق میں رکاوٹ نہ بن سکی اور اس راہ کی کوئی مشکل ان کے پاؤں کی بیڑی نہ بن سکی۔ وہ جب اپنے رب سے جُڑے تو اس شان کے ساتھ جڑے ہیں کہ جو چیز بھی اللہ کو ناپسند ہے' اس سے کٹ گئے۔ ان کی کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ "اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالْبُغْضُ لِلّٰہِ" یعنی "کسی سے محبت ہے تو صرف اللہ کے لئے اور اگر کسی سے بغض و عداوت ہے تو صرف اللہ کے لئے"۔

آگے بڑھئے! فرمایا : وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ "اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے"۔ یہاں ایک اشکال کا رفع ہونا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اہلِ ایمان کو قریشِ مکّہ نے خود تو نہیں نکالا تھا۔ اہل ایمان نے خود دو بار حبشہ کی طرف اور آخری بار یثرب (مدینہ منورہ) کی طرف ہجرت کی تھی۔ قریش تو ان کو روکنے کے درپے تھے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ قریشِ مکہ نے ان اہل ایمان پر مظالم و شدائد کی وہ حد کر دی تھی کہ ان کا مکہ میں رہنا دوبھر اور اجیرن ہو گیا تھا۔ ان کے مظالم جن اہل ایمان کے لئے برداشت کی حدود سے نکل گئے تھے انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی اجازت سے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ اسی بات کو یہاں ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے : وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ "اور وہ لوگ جو اپنے گھروں سے نکالے گئے"۔

آگے چلئے' فرمایا : وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ "اور جنہیں میری راہ میں ایذائیں

پہنچائی گئیں۔" چنانچہ جو کچھ بیتا حضرت بلالؓ پر اور جو قیامت گزری حضرت خباب بن آرتؓ اور بہت سے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر' پھر جس بہیمانہ طریقے پر حضرت یاسرؓ اور ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سمیہؓ شہید کی گئیں' ان تمام ایذاؤں اور مظالم و شدائد کا اندازہ کیجئے جس کے تصور ہی سے ایک حساس و درد مند دل لرز اٹھتا ہے اور پھر سوچئے کہ ان حضرات کرامؓ نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ زر' زن اور زمین کے جو جھگڑے دنیا میں مشہور معروف ہیں' ان میں سے کسی کے ضمن میں ان کا کسی سے کوئی تنازع اور قضیہ نہیں تھا۔ ان کا جرم کوئی تھا تو صرف یہ کہ انہوں نے کلمہ توحید کو قبول کر لیا تھا اور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستگی اختیار کر لی تھی۔ مزید برآں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو اعلانِ نبوت و رسالت سے قبل قریش کی آنکھوں کا تارا تھے' جن کا ذکر وہ الصادق اور الامین جیسے اعلیٰ القاب کے بغیر نہیں کرتے تھے' وہ ان کے مخالف کس لئے اور کس وجہ سے تھے؟ یہاں "فِیْ سَبِیْلِیْ" کے الفاظ کے ذریعے ان تمام اہل ایمان کو خراج تحسین ادا کیا جا رہا ہے کہ وہ لوگ جو صرف میری خاطر مصائب کا نشانہ اور تشدد و ستم کا نوالہ بنے اور صرف میرے دین کی خاطر جاں گسل آزمائشوں کی بھٹیوں میں سے گزرے۔ واضح رہے کہ یہاں تک جن ایذاؤں کا ذکر ہوا ان کا تعلق مکی دور سے ہے۔

اب آگے مدنی دور کا ذکر آ رہا ہے۔ سورۃ آل عمران مدنی ہے۔ اس دور میں جنگ اور قتال کا سلسلہ شروع ہوا۔ جنگ کیا ہے؟ آیۂ بِر کے مطالعے کے دوران ہمارے سامنے یہ بات آ چکی ہے کہ نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر اللہ کے دین کے غلبہ کے لئے ایک بندۂ مومن معرکۂ قتال اور میدانِ جنگ میں آ جائے تو یہ نیکی کی بلند ترین چوٹی ہے۔ یہاں یہی بات ان الفاظ میں وارد ہوئی : "وَقَاتَلُوْا وَقُتِلُوْا" "اور انہوں نے اللہ کی راہ میں جنگ کی اور انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی گردنیں کٹوا دیں اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا"۔ پس جن لوگوں کا یہ مقام ہے' جن کے یہ مراتب ہیں' جن کے ایثار و قربانی کی یہ شان ہے تو ان کو بشارت ہو کہ لَاُکَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ "میں لازماً ان سے ان کی برائیاں دور کر دوں گا"۔ بربنائے بشریت کہیں کوئی لغزش ہو گئی ہو' کبھی جذبات کی رو میں آ کر کسی غلط حرکت کا صدور ہو گیا ہو تو اس سے ہم چشم پوشی فرمائیں گے' ان کو معاف کر دیں گے۔ ان

کے دامنِ کردار پر اگر کوئی داغ دھبّہ ہے تو ہم اسے دھو ڈالیں گے۔ ان کے نامہ اعمال میں اگر سیاہی کے کچھ داغ ہیں تو ہم ان کو صاف کر دیں گے۔ یہاں جو پہلے لامِ مفتوح اور آخر میں نونِ مشدد آیا ہے عربی زبان میں یہ تاکید کا سب سے بڑا اسلوب ہے۔ مفہوم ہوگا کہ "میں لازماً دور کر کے رہوں گا"۔

آگے فرمایا: وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ یہاں بھی تاکید کا وہی اسلوب ہے۔ "اور میں لازماً ان کو داخل کر کے رہوں گا ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہیں"۔ آیت کا اختتام ہوتا ہے: ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ "یہ بدلہ ہے خاص اللہ کے پاس سے"۔ یہاں پر جو "مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ" کے الفاظ آئے ہیں ان میں ایک خاص کیفیت ہے، یعنی اپنے خاص خزانۂ فضل سے انہیں نوازوں گا۔ یہ لوگ میرے مقربینِ بارگاہ ہوں گے، ان کو جو کچھ میں عطا کروں گا وہ اپنے خاص خزانہ فیض سے عطا کروں گا۔ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ○ "اور یہ جان لو کہ اچھا بدلہ اور عمدہ صلہ صرف اللہ کے پاس ہے"۔ یہاں بھی حصر کا مفہوم موجود ہے۔ حصر کے اسلوب کے متعلق پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ اس اسلوب سے "صرف" کا مفہوم پیدا ہوا۔ یعنی "اچھا بدلہ تو صرف اللہ ہی کے پاس ہے"۔ اس میں ایک لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ انسان محنتیں کرتا ہے، بھاگ دوڑ کرتا ہے تو کسی نہ کسی فائدہ، نفع اور بدلہ کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اولاد پر انسان محنت کرتا ہے، اپنے آپ کو کھپاتا ہے، اس امید میں کہ یہ ہمارے بڑھاپے میں ہمارا سہارا بنیں گے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بڑھاپے میں اولاد کی طرف سے خلافِ توقع ایک غلط طرز عمل سامنے آتا ہے۔ انسان کو صدمے جھیلنے پڑتے ہیں۔ اولاد کے غلط طرز عمل اور رویّے کی وجہ سے انسان نفسیاتی وذہنی کرب سے دوچار ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ صرف وہ محنت اور وہ کوشش لازماً نتیجہ خیز ہوگی جو اللہ کے لئے کی گئی ہو۔ اس کا اچھا بدلہ مل کر رہے گا۔ ہر وہ ساعت لازوال اور غیر فانی ہو جائے گی جو اللہ کے لئے صرف کی گئی ہو اور اس کے دین کی خدمت میں لگائی گئی ہو۔ اسی طرح ہر وہ پیسہ محفوظ ہو جائے گا جو اللہ کے دین کے لئے خرچ ہوا ہو۔ یہ تمام مفاہیم اس آیہ مبارکہ کے اختتامی الفاظ میں موجود ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین ○○

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

خود پڑھیے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفۃً پیش کیجئے

نوٹ

اس کتابچے کا انگریزی، عربی، فارسی اور سندھی زبانوں میں بھی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اس کے حقوقِ اشاعت نہ ڈاکٹر صاحب کے حق میں محفوظ ہیں نہ انجمن کے

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور

۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور۔

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاهور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ